

قرآن نا فہمی کے اسباب اور اس کا حل

قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا۔ اور دنیا میں شاید عربی ہی ایک ایسی زبان ہے جو ترجمہ کے بغیر پڑھائی جاتی ہے۔ بچہ جب پہلی جماعت سے انگریزی پڑھنا شروع کرتا ہے تو اسناد اسے بتلاتا ہے کہ "APPLE" "APPLE" بمعنی "سیب"۔ اسی طرح فارسی پڑھنے والے بچے کو مدر "آب" اور "است" ہی نہیں پڑھایا جاتا بلکہ یہ بھی بتلایا جاتا ہے کہ "آپ" کے معنی "ہانی" اور "است" کے معنی "ہے" ہوتا ہے۔ لیکن جو بچے عربی پڑھتے ہیں، انہیں صرف الفاظ ہی پڑھائے جاتے ہیں۔ الفاظ کے معانی کا خیال کسی کو محبوبے سے بھی نہیں آتا۔

اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہمیں یہ بات ذہن نشین نہ کی گئی ہے کہ قرآن کریم کا ناظرہ پڑھنا ہی باعث برکت ہے۔ دلیل کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش کیا جاتا ہے: "قرآن کریم کے ہر حرف کے بدلے ایک نیکی ملتی ہے۔ اور ہر نیکی کا دس گنا اجر ملے گا۔ میں نہیں کہتا کہ آتم ایک حرف ہے۔ بلکہ الف ایک حرف ہے، ل الگ حرف ہے، ا و ز م الگ حرف! (ترمذی)

اس سے ہم عامیوں نے یہ سمجھ لیا کہ اگر قرآن کریم کو ناظرہ پڑھنے سے ہی اتنی زیادہ نیکیاں مل جاتی ہیں تو پھر ترجمہ پڑھنے پر اُٹھاتے اور سمجھنے سمجھانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک: "خیر کلمۃ تعلم القرآن وعلمہ" (منفق علیہ)

تم میں سے بہتر وہ ہے جو خود قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔
... سے بھی ہم نے یہی سمجھ لیا کہ بس قرآن کریم ناظرہ پڑھنے پڑھانے سے ہی آپ کے استاد کی کما حقہ تعمیل ہوگئی۔

لیکن معاملہ یوں نہ تھا جو ہم غلطی سے سمجھ بیٹھے۔ قرآن کریم جو عربی میں نازل ہوا ہے، صرف اہل عرب کیلئے نہیں پوری دنیا کے انسانیت کیلئے نازل ہوا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں خواہ سنی ہوں یا اجمعی، قرآن کریم پڑھنے کا زیادہ سے زیادہ شوق اور اس کی رغبت پیدا ہو۔ اور اہل عجم محض اس خیال سے کہ ابھی وہ قرآن کریم کے معانی و مطالبات نہیں سمجھتے، قرآن کریم کی تلاوت سے بھی غافل نہ ہو جائیں۔ چنانچہ اس ناظرہ پڑھنے کی ترغیب کا یہ فائدہ ہوا کہ ان مسلمانوں کے دلوں میں قرآن کریم کے معانی و مطالبات بھی جلد از جلد سمجھنے کی تڑپ پیدا ہوئی اور انہوں نے صرف دینی تعلیم کے حصول کیلئے طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کیں بلکہ آنے والی نسلوں کیلئے شریعت کے ہر ہر پہلو پر ایسا قیمتی ذخیرہ بھی کتابوں کے اوراق میں محفوظ کر دیا کہ ان کے اس احسان سے ہم شاید کبھی بھی سبک دوش نہ ہو سکیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک جامع تھا، اسلاف نے اس کی حقیقت کو پہچان لیا اور اس پر عمل کر کے دکھلا دیا۔ لیکن ہم اس کی تہ تک نہ پہنچ سکے اور تیسرے قرآن کریم کی تعلیمات سے دور ہٹتے چلے گئے۔ اگر بات صرف یہیں تک محدود رہتی تو بھی مسلمانوں میں ہمہ پہلو انحطاط رونما نہ ہوتا، علمائے حق، عوامی جہالت کے اس غلا کرملکی زبان میں تبلیغ کے ذریعہ پرکھ سکتے تھے، لیکن ستم تو یہ ہے کہ اس قرآن نامہی کے اور بھی بہت سے اسباب پیدا ہو گئے۔ اور یہ ایک دلخراش حقیقت ہے کہ یہ اسباب ان لوگوں کے پیدا کردہ ہیں جنہیں ہم دین اسلام کی بزرگ ہستیاں سمجھتے ہیں۔ آج ہم انہی اسباب کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ پہلا سبب، قرآن کریم کو مشکل ترین کتاب سمجھ لینا:

قرآنی مجید میں ہے:

”وَلَقَدْ يَسَّنَّا الْقُرْآنَ لِلَّذِ كَرَفَهْلَ مِنْ مَّنْ كَرَهْلَ“

”اور ہم نے قرآن مجید کو سمجھنے کیلئے آسان کر دیا ہے، تو کوئی ہے کہ سوچے اور سمجھے؟“ لیکن ہمیں یہ بات باور کرا دی گئی ہے کہ قرآن کریم ایک مشکل ترین کتاب ہے اور اس کو سمجھنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ لہذا عوام الناس کیلئے بھی بہتر ہے کہ وہ کسی عالم دین کی اتباع اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ نے تو قرآن عام لوگوں کیلئے اتارا اور سہل زبان میں نازل کیا تھا لیکن اس ارشاد کے علی الرغم قرآن کریم کو عوام کے ذہن سے بالاتر اور مشکل ترین کتاب قرار دے دیا گیا۔ اور اس کا ثبوت آپ کو دینی مدارس میں مردوبہ نصاب سے مل جائیگا۔ آپ کسی بھی دینی مدرسہ کے نصاب تعلیم پر نظر ڈالئے، آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم پڑھنے پڑھانے کی نوبت سب سے آخری سال آتی ہے۔ اگر کسی مدرسہ کا نصاب تعلیم سال

ہے تو تفسیر و قرآن چھٹے سال، اور اگر ۹ سال کا ہے تو نو سال پڑھایا جاتا ہے۔ پہلے سالوں میں علی الترتیب صرف نحو، منطق، ادب اور فقہ وغیرہ پڑھائے جاتے ہیں۔ اختتامی سال سے ایک سال قبل کو دورہ حدیث اور آخری سال کو قرآن کریم کی تعلیم کے لئے مختص کیا جاتا ہے۔ ایسے مجوزہ نصاب تعلیم کی مصلحت خواہ کچھ بھی ہو، ایک عام آدمی یہی تاثر لیتا ہے کہ قرآن کریم شاید ان تمام کتابوں سے مشکل ترین کتاب ہے۔ جمعی تو اس کی نوبت سب سے آخر میں آتی ہے۔

تقلید جامد:

قرآن کریم کو سب سے آخر میں پڑھانے کی جو مصلحت بیان کی جاتی ہے اس سے یکسر انکار کرنا مشکل ہے لیکن تکلیف دہ امر یہ ہے کہ حقیقتاً جس مصلحت کیلئے قرآن کریم کو آخر میں ڈالا گیا، وہ کچھ اور ہے۔ اور اسے پردہ راز میں رکھا جاتا ہے۔ یہ مقصد عقیدہ تقلید کی حفاظت ہے۔ مقلدین کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ قرآن و سنت کو اپنے امام کی فقہ کی عینک سے دیکھا جائے۔ پہلے مبتدی کو فقہ کی تمام متعلقہ کتب پڑھائی جاتی ہیں اور جب اس کے ذہن پر فقہ کی چھاپ لگ جاتی ہے تو وہ قرآن و سنت سے نتائج اخذ کرنے میں وہی روش اختیار کرتا ہے جو اس کے نصاب تعلیم کی ترتیب کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے امام سے ہٹ کر کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہتا ادا کر لیں اسے الجھاؤ یا تضاد نظر آتا بھی ہے تو وہ اس کی تحقیق کی ذمہ داری اپنے امام کے سر ڈال دیتا ہے۔ کیونکہ تقلید کی تعریف ہی یہ کی جاتی ہے:

”والتقليد قبول قول غير بلا دليل فكانت جعله قلاوة في عنقه“ (شرح قصیدہ)

انما الى از ملا علی قاری حنفی)

اس تعریف سے واضح ہے کہ مقلدین ذہنی طور پر اپنے امام کو امام نہیں بلکہ پیغمبر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ پیغمبر ہی ایک ایسی ہستی ہو سکتی ہے جس کی بات بلا دلائل قبول کی جائے۔ پیغمبر کے علاوہ کوئی اور ہستی معصوم اور مبرا عن الخطا نہیں ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ جس تحقیق کی ذمہ داری امام کے سر ڈالی جاتی ہے، وہ خود اس ذمہ داری کو قبول کرنے کیلئے قطعاً تیار نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں زیادہ تر حنفی مذہب ہی رائج ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے تھے کہ: ”جب صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے!“ بلکہ آپ نے یہاں تک کہہ دیا:

”اگر حدیث مل جائے تو میرے قول کو دلو اور پرے بٹخ دو!“

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ کے معروف شاگردوں امام محمد اور امام زفر نے بہت سے مسائل میں آپ سے اختلاف کیا۔ لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ امام موصوف کے ان اقوال کے علی الرغم، ان کے مقلدین حدیث کی دوزخ کا رتاویلات میں مشغول ہو جاتے ہیں یا اس کی ذمہ داری امام کے سر ڈال کر اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن اپنے امام کے قول کو چھوڑنا انہیں قطعاً گوارا نہیں ہوتا۔

اگر فقہ سے پہلے قرآن و حدیث پڑھایا جائے تو ابتدائی کے ذہن پر پہلی چھاپ قرآن و حدیث کی ہوگی۔ مسائل کے حل و استنباط میں وہ فقہ سے مدد تو لے گا لیکن علامہ مقلد نہیں رہ سکتا۔ لہذا تقلید کے اس "کار" کیلئے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم سب سے آخر میں رکھی جائے۔

فقہ کی تدوین کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں مسائل حاضرہ کا قیاس اور اجتہاد کے ذریعہ صحیح حل تلاش کیا جائے۔ ائمہ فقہاء نے اسی مقصد کے پیش نظر اپنے اپنے دور میں فقہ کی تدوین کی۔ اور اس دور کے مسلمانوں نے بھی یہی کچھ سمجھا۔ لیکن بعد کے مسلمانوں نے آئندہ اجتہاد کو شجر ممنوعہ قرار دیکر ہر جہاں ائمہ فقہاء میں سے کسی ایک کی اتباع کو اسلام کا جزو بنادیا — پانچویں صدی ہجری میں یہ عقیدہ اتنا راسخ ہو گیا تھا کہ جو شخص کسی مخصوص امام کا مقلد نہ ہوتا، اسے بطور گالی یہ کہا جاتا تھا کہ وہ چاروں مذاہب سے باہر ہے۔ بالفاظ دیگر اس کا اسلام ہی مشکوک ہے۔

اس جانتہ تعلید نے مسلمانوں کے حواس معطل کر دیے۔ قرآن و حدیث کو پڑھنے پڑھانے اور اس میں غور و فکر کی ضرورت ہی کو ختم کر دیا گیا تو اس کی صلاحیت کہاں باقی رہتی؟ — اس صورت حال کا نقشہ پر فیم محمد سلیمان اظہر بجزو التاریخ فرشتہ لہ سیرت محمد بن عبدالوہاب میں یوں کھینچتے ہیں:

"عربی سے صرف چند لوگ ہی آشنا تھے اور انہوں نے جاہل عوام کو جو بیڑوں کا گلہ بنائے رکھنے کے لئے عربی میں موجود اسلامی علوم پر اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ ملکی زبان میں کتاب و سنت کے نہ تراجم تھے نہ شروحات، لوگ کبھی کبھی قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے۔ لیکن اس میں کیا لکھا ہے، اس سے سراسر نا آشنا تھے۔ تقلید و بھوک کی بندش اس قدر مضبوط ہو چکی تھی کہ ایک مناظرہ میں خواجہ نظام الدین اولیا نے جب اپنی تائید میں ایک روایت بطور استدلال پیش کی تو ہندوستان کے سب سے بڑے فقیہ خواجہ رکن الدین صاحب نے کہا کہ: "میں بھی مقلد ہوں اور آپ بھی مقلد ہیں، اس لئے حدیث کی کیا ضرورت ہے؟ امام ابوحنیفہ کا قول پیش فرمائیے!"

ظاہر ہے کہ ایسا عقیدہ قرآن و سنت کے یکسر منافی ہے۔ صحابہ اور تابعین آخر کس امام کے مقلد تھے؟

جبکہ فقر کی تدوین ہی بہت بعد میں ہوئی۔ نیز آیت ”اليوم اكملت لکم دینکم“ کے مصداق دین کی تکمیل بہت پہلے ہو چکی تھی اور اسلام مکمل صورت میں موجود تھا۔

بائیں ہمارے چونکہ اللہ تعالیٰ نے تاقیامت اپنے دین کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے لہذا تاریخ سے تاریک دور میں بھی علمائے حق کی ایک جماعت نے، خواہ وہ کتنی ہی قلیل ہو، قرآن و سنت کو سینہ سے لگائے رکھا اور باطل سے برسرِ پیکار رہی۔ یہ جماعت اہل سنت کہلوائی۔ لیکن جب مخالف فرقوں نے بعض سیاسی اغراض کی بنا پر انہیں ”وہابی“ کی مذہبی گالی سے نوازا شروع کیا تو انہوں نے اہل حدیث کہلوانا گوارا کر لیا۔ یہ جماعت دینی مدارس میں رائج درس نظامی کی اس ”مصلحت“ سے خوب واقف تھی لہذا اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہی۔ جناب حافظ نذر محمد صاحب پرنسپل شبلی کالج لاہور اپنی تصنیف ”مدارس عربیہ کا جائزہ“ میں ”درس نظامی میں اصلاحات کی تجاویز“ کے تحت لکھتے ہیں:

”درس نظامی پر بیرونی حلقوں سے مسلسل یہ اعتراض رہا ہے کہ مدارس الحديث کے علاوہ باقی تمام مدارس میں قرآن و حدیث کو صرف آخری سالوں میں سبقاً سبقاً پڑھایا جاتا ہے۔ حالانکہ دین کے یہی اصل اصول ہیں۔ کسی نہ کسی بہجہ پر ان کا مطالعہ ابتدا سے شروع ہونا چاہیے۔“

دوسرا سبب، پیرانِ عظام کے مخصوص نظریات:

(۱) ولایت کا معیار:

اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ ہندوستان میں اسلام زیادہ تر صوفیائے کرام کے توسط سے ہی پھیلے۔ یہ لوگ خود عموماً عالم باطن تھے۔ لیکن بعد میں آنے والے جانشین قرآن و سنت کی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے چلے گئے، اور اس کی وجہ غالباً وہی ہے جو پہلے ذکر کی جا چکی ہے۔ ولایت کا معیار کرامات اور عوارق عادات و واقعات قرار پائے اور یہی اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ کرامات کے ظہور کیلئے دیندار اور متقی ہونا تو کجا، مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں

حاشیہ صفحہ گزشتہ: محمد قاسم فرشتہ مورخ، متوفی ۱۰۲۱ھ

۱۔ یہ نصاب آج سے تقریباً اڑھائی سو سال پیشتر سے دینی مدارس میں رائج ہے۔ مولوی نظام الدین (متوفی ۱۱۶۱ھ) نے اسے مرتب کیا تھا۔

کیونکہ ہندوؤں کے جوگیوں اور سادھوؤں سے بھی ایسی کرامات اور خوارق عادات واقعات کا ظہور اکثر تذکروں میں موجود ہے۔ یہی ہندو انہ تاثر مسلمانوں نے بھی اپنایا اور ساتھ ہی ساتھ یہ آیت بھی چسپاں کر دی:

”ان اولیاء اللہ لا خوف ولا هم یحزنون“

لیکن علمی فقدان کی وجہ سے یہ خیال کسی کو بھی نہ آتا تھا کہ قرآن کریم جن لوگوں کو ”اولیاء“ کہتا ہے ان کے اوصاف کیا ہیں؟ کیا وہ اولیاء ربیہی لوگ ہیں، جو خوارق عادات و واقعات کے حصول کیلئے قبروں پر مراقبہ کرتے اور مختلف قسم کی چلہ کشی کو اپنا شعار بناتے ہیں؟ شریعت میں تو سرے سے مزاروں کا وجود، مراقبہ اور چلہ کشی ہی ممنوع ہے۔ تو پھر یہ لوگ اولیاء کیسے ہو گئے؟ اس کے برعکس قرآن مجید ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دوست قرار دیتا ہے جو مومن، متبع شریعت ہوں، اتقار کے درجے پر ہوں۔ آیت مذکورہ بالا سے اگلی آیت یوں ہے:

”التذین آمنوا وکانوا یتقون“

شریعت، طریقت اور معرفت کا عقیدہ:

اس مشکل سے نجات حاصل کرتے کا واحد ذریعہ یہی تھا کہ مریدوں کو قرآن کی تعلیم سے بے بہرہ رکھا جائے۔ چنانچہ مریدوں کو یہ ذہن نشین کرایا گیا کہ شریعت جو قرآن و حدیث میں مذکور ہے، یہ محض ابتدائی اور سطحی درجہ ہے۔ اس سے اگلی سیٹیج ”حقیقت“ اور سب سے اعلیٰ درجہ ”معرفت“ ہے۔ اور یہ بھی باور کرایا گیا کہ پیران عظام طریقت کے بلند تر مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ لہذا انہیں شریعت کی حدود و قیود سے پرکھنا قطعاً درست نہیں ہے۔ یہ لوگ صاحبِ حال ہوتے ہیں لہذا ان کے اعمال و کردار کا ظاہری شریعت کے احکام سے تقابل ان کی شان کے خلاف ہے۔ حتیٰ کہ اگر یہ پیران باصفا کسی ایسی بات کا حکم دیں جو شریعت کے سراسر خلاف نظر آتی ہو تو بھی مرید پر لازم ہے کہ وہ بلا چون و چرا ان کی اطاعت کرتا چلا جائے۔ صرف اسی صورت میں وہ سلوک کی منازل طے کر سکتا ہے۔ حافظ سعدی شیرازی متوفی ۷۹۱ھ نے انہی افکار و نظریات کو اپنے درج ذیل شعر میں قلمبند کیا ہے:

مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغان گوید

کہ سالک بے خبر نمود از راہ و رسم منزل نا

ترجمہ: اگر تجھے بزرگ پیر اپنے معصیٰ کو شراب میں رنگین کرنے کا حکم دے تو ضرور ایسا کر کہ سالک سلوک کی

منزلوں کے آداب و مراسم سے ناواقف نہیں ہوتا۔

ظاہر ہے کہ قرآن و سنت میں ایسی خرافات کی کوئی گنجائش نہیں لہذا اگر قرآن مجید کی تعلیم عام ہو جائے تو ان گے کاروبار پر کاری ضرب پڑتی ہے۔ لہذا ان لوگوں نے عمداً یہ وطیرہ اختیار کیا کہ اپنے مریدوں کو قرآنی تعلیمات سے بے خبر رکھیں اور انہیں غفلت کی نیند سو یا رہنے دیں۔
غوث اقطب ابدال :

یہ بات اس سے بھی آگے بڑھتی گئی۔ اور یہ چیز بھی عقیدہ میں شامل کر دی گئی کہ اس دنیا میں ہر وقت ۳۱۳ نجیب موجود رہتے ہیں۔ پھر ان میں سے ۷۰ نقیب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۴۰ ابدال ہوتے ہیں۔ پھر ان میں سے ۷ نقیب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۴۰ ابدال اور پھر ان میں سے صرف ایک غوث کا اعلیٰ مقام حاصل کرتا ہے جو ہمیشہ مکہ مکرمہ میں رہتا ہے۔ جب بھی اہل زمین پر کوئی ارمی یا سماوی آفت نازل ہوتی ہے تو وہ نجباء کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ نجیب یہ درخواستیں نقیبوں کو پیش کرتے ہیں اور بالآخر یہ درخواست بدترتیب و حفظ مراتب ...
(THROUGH PROPER CHANNEL) غوث تک پہنچتی ہے جس کا علم اللہ کے علم کے برابر ہوتا ہے اور اس کی قدرت اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کم نہیں ہوتی اور وہ ان معائب کو دور کر دیتا ہے۔ الیاذ باللہ!

یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ ان عقائد نے کہاں سے راہ پائی اور ان خرافات کے ماخذ کیا ہیں۔ قرآن و حدیث اور کتب حیر میں ان کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ امام حسنؒ کو غوثِ اول کہا جاتا ہے تو آخر ناریخ و سیر کی کتب کیوں خاموش ہیں؟ پھر ان کی اقامت مکہ مکرمہ میں نہ تھی۔ پیر عبدالقادر جیلانیؒ جو غیاث المستغیثین یا سب سے بڑے غوث کہے جاتے ہیں۔ ساری زندگی بغداد میں رہے۔ ان کا مولد و مدفن بھی یہی جگہ ہے۔ تو پھر جب وہ غوث کی شرائط ہی پوری نہیں کرتے تو غوث کیونکر ہو گئے؟ ان مذکورہ دو غوثوں کے علاوہ آج تک کون کون سے غوث پیدا ہوئے اور آج کل مکہ مکرمہ میں کون صاحب غوث کے مقام پر فائز ہیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں کہ جن کا جواب ان لوگوں کے پاس بھی نہیں ہے۔ اگر قرآن و سنت کی تعلیم عام ہو جائے تو ریت کے تودہ پر تعمیر شدہ یہ عمارت و صراط سے زمین پر آگرتی ہے۔ لہذا ان غلط عقاید کا تحفظ اسی بات میں تھا کہ عوام کا لالچام کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کے قریب بھی نہ پہنچنے دیا جائے۔

مزارات اور آستانوں کا وجود :

اس کا ایک اور پہلو مزاروں اور آستانوں کا وجود بھی ہے جو قرآنی تعلیمات عام ہونے کی صورت میں یقیناً خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ اگر آپ کو کسی مزار یا آستانے پر جانے کا اتفاق ہو تو آپ ملاحظہ فرمائیے کہ وہاں مشرکانہ رسوم کس کس طور پر ادا کی جاتی ہیں، عقیدہ لوگوں کو کیونکر گراہ کیا جاتا ہے؟ ایسے لوگ جنہوں نے عمر بھر کبھی نماز ادا نہ کی ہو، ساتویں دن دیوار کی حاضری کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟ شفاعت، نجات اور جنت کے سرٹیفیکیٹ کہاں کہاں سے ملتے ہیں اور یہ عطا کنندگان کون اور کیسے لوگ ہیں؟ بے دین اور بدکار مجادروں کو فحاشی اور بدکاری کے کیسے کیسے مواقع میسر آتے ہیں۔ بھنگ اور چرس کا دور کیسے چلتا رہتا ہے؟

اب آپ خود ہی غور فرمائیے کہ شریعتِ مطہرہ میں ایسی باتوں کی گنجائش کہاں ہے؟ ظاہر ہے اگر مریدانِ باصفا، کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرا دیا جائے تو اس مکروہ کاروبار کا وجود خطرے میں پڑ جائیگا۔ لہذا اس طبقہ نے اپنی بقا اور عافیت اسی میں سمجھی کہ عوام کو قرآنی تعلیمات سے بے بہرہ ہی رکھا جائے۔ نہ رہے بانس نہ بیجے بانسری!

رمضان شہ میں جب مکہ فتح ہو گیا اور عرب کا بیشتر علاقہ اسلامی اقتدار کے زیرِ نگیں آ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسی ماہ مبارک میں جہاں عزیمت، سواح، اور منات کے بتوں کو پاش پاش کرنے کیلئے علی الترتیب حضرت خالد بن ولید، حضرت عمرو بن العاص، اور حضرت عبید بن زید کی قیادت میں سرایا روانہ کئے وہاں حضرت علیؓ کی قیادت میں ایک وفد اس غرض سے بھی بھیجا کہ مزارات کو منہدم کر دیا جائے اور جو قبریں زمین سے ایک بالشت سے زیادہ اونچی ہوں خواہ پختہ ہوں یا کچی، انہیں زمین کے برابر کر دیا جائے۔

اس کے برعکس ہندوستان میں بہت سے ہندو، صوفیائے کرام کے توسط سے مسلمان ہوئے۔ جن کے ہاں ایسے لاتعداد آستانے پہلے سے موجود تھے۔ اور چونکہ شرعی تعلیم کی طرف پوری توجہ د دی گئی لہذا ان نو مسلموں کے اعتقادات اور افکار و نظریات میں کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہ ہو سکی۔ اور رونما بھی کیونکر ہوتی۔ پہلے وہ مندروں میں بتوں کے سامنے سر بسجود تھے تو اب مزارات ان کیلئے سجدہ گاہ بن گئے تھے۔ پہلے دیوتاؤں کے سامنے دستِ سوال دراز کیا جاتا تھا، اب صوفیا اور پیروں نے ان کی جگہ لے لی جن سے وہ مرادیں مانگنے لگے۔ ان حالات میں اسلام کی پابندی اور اعمالِ حسنہ کی کوئی اہمیت باقی نہ رہی تھی۔ لہذا وہ روحانی مارج، شرک، دھوکا، قبروں پر جادو،

اور مرشد کی توجہ کے محتاج ہو کر رہ گئے۔ اس ظلمت کدہ میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی متوفی ۱۰۳۲ھ نے حق کی آواز بلند کی اور ان مشرکانہ افکار و نظریات پر کاری ضرب لگائی۔ ان کی بھرپور کوششوں سے یہ فتنہ کسی حد تک دب گیا۔ لیکن چونکہ قرآن مجید کی تعلیم کیلئے کوئی مؤثر کوشش نہ کی گئی تھی۔ لہذا اس فتنہ نے پھر سے اپنے پاؤں پھیلانے شروع کر دیے۔ بالآخر اس مرض کی صحیح تشخیص کی سعادت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۸۱ھ) کے حصہ میں آئی۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کیلئے قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ شائع کرا دیا تاکہ عام طبقہ جو عربی زبان سے ناواقف ہے، ملکی زبان میں قرآن کی تعلیم سے آشنا ہو سکے۔ لیکن ہمارے احباب و رہبان جنہوں نے ”ارباباً من دون اللہ“ کا مقام حاصل کر لیا تھا، کی طرف سے اس کا رد عمل یہ ہوا کہ وہ ان کے درپے آزار ہو گئے اور ان پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ اس کے باوجود آپ نے ہمت نہ ہاری اور اسلامی تعلیمات سے متعلق نہایت قیمتی ذخیرہ فارسی زبان میں منتقل کر دیا۔ بعد ازاں آپ کے خاندان سے شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر صاحبان نے اردو زبان میں قرآن کریم کے تراجم پیش کئے جو آج تک بہ نظر استخوان دیکھے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی کوششوں سے بہت سے لوگ فیضیاب ہوئے اور قرآنی تعلیمات میں دلچسپی لینے لگے۔

انہی دنوں عرب میں شیخ محمد بن عبد الوہاب رحمۃ اللہ علیہ نے شرعی تعلیم کے نفاذ کیلئے بھرپور جدوجہد شروع کر رکھی تھی۔ کیونکہ وہاں بھی دینی تعلیم مفقود تھی اور لاتعداد آستانے وجود میں آچکے تھے جہاں مشرکانہ رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ شیخ موصوف کی اس تحریک کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور عرب کا علاقہ آہستہ آہستہ اس کے زیرِ نگیں آنے لگا۔

یہ صورت حال دیکھ کر وہاں کے اجمار و رہبان حرکت میں آئے اور غیر شرعی حکومت میں شامل ہو کر شیخ مذکور پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ آپ کی جماعت کو شیخ مذکور کے نام ”محمد“ کی نسبت سے محمدی کہنے کی بجائے احمد و بعض کی بنا پر وہابی کہنا شروع کیا اور یہ لفظ آہستہ آہستہ گالی اور طعن قرار پایا۔

بعینہ اسی دور میں ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسماعیل شہید نے سید احمد بریلوی کی قیادت میں انہی مقاصد کی خاطر ایک تحریک چلائی جسے قبولِ عام حاصل ہوا اور

لے ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا ترجمہ تھا جو ملکی زبان میں شائع ہوا۔

مجاہدین کی ایک جماعت تیار ہو گئی۔ گو اس جماعت کے قائدین سکھوں اور بٹھانوں کی ملی جھگڑت سے ۱۲۴۶ھ میں بالاکوٹ میں شہید ہو چکے تھے تاہم یہ جماعت بدستور کام کر رہی تھی اور انگریز کو اس جماعت سے سخت خطرہ لاحق تھا۔ لہذا یہاں بھی اس تحریک کو دہلائی کی گالی سے نوازنا جانے لگا۔ مزید برآں انگریز نے اس مشکل کا حل یہ سوچا کہ مسلمانوں میں انتشار و افتراق پیدا کر کے انہیں باہم دست و گریباں کر دیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے انگریز بہادر کی نظر انتخاب دو آدمیوں پر پڑی۔

پہلی شخصیت مرزا غلام احمد قادیانی (متوفی ۱۳۲۶ھ) تھا۔ جس نے خود نبوت کا دعویٰ کر کے اپنی الگ امت تیار کی۔ یہ لوگ باقی تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتے تھے۔ انگریز کی نظر کرم اور عنایات کے باوجود اس جماعت کی خاطر خواہ پذیرائی نہ ہو سکی۔ کیونکہ حتم نبوت کا عقیدہ ایسا عقیدہ تھا جو تمام دنیا کے مسلمانوں میں بالائے نقاد پایا جاتا تھا۔

دوسری شخصیت احمد رضا خاں بریلوی (متوفی ۱۳۴۰ھ) تھے۔ جو عاشق رسول بن کر سامنے آئے۔ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف کے نام پر ایسے عقائد کی بنا ڈالی جو اس سے پہلے تمام امت مسلمہ میں کبھی نہ پائے گئے تھے۔ مثلاً جس طرح اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہے، اسی طرح حضور اکرم بھی ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کو مکمل طور پر پیغمبر کا علم ہے، ایسے ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہے فرق صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی ہے اور آپ کا عطائی — ذاتی اور عطائی "تقسیم" کے موجد آپ ہیں!

یابہ کہ آپ بشر نہیں بلکہ نور تھے۔ نیز یہ کہ اہل قبور پکارنے والے کی پچھ کو سنتے اور اس کی حاجت روائی کی استطاعت رکھتے ہیں۔ چونکہ عشق رسول کے نام پر یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا، لہذا جاہل عوام میں انہیں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔

نتیجہ امام:

یہ لوگ چونکہ اہل سنت والجماعت کہلاتے اور فقہ حنفی کے مقلد ہونے کے دعویدار تھے۔ امام ابو حنیفہؒ ایسے مشرک و کافر عقائد کے سخت دشمن تھے لہذا ان لوگوں نے واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ وہ صرف فقہی مسائل کی حد تک امام ابو حنیفہؒ کے مقلد ہیں، عقائد میں ان کے مقلد نہیں ہیں۔ یہ لوگ احمد رضا خاں بریلوی کی نسبت سے بریلوی حنفی کہلائے۔ اور اسی بنا پر انہیں امام اہل سنت

کہ جاتا ہے۔ اور جو حنفی اپنے دستور سابق پر قائم رہے وہ حنفی دیوبندی کہلائے !
انگریز کی چال بہت کامیاب رہی۔ دیوبندی اور بریلوی حضرات میں بحث مباحثے، مناظرے،
سر پھٹول اور تکفیر بازی شروع ہو گئی۔ بریلوی حضرات جماعت اہل حدیث کو، جن میں سے اکثر
شاہ اسماعیل شہید کی تحریک کے کارکن تھے، وہابی کہتے ہی تھے، اب دیوبندیوں کو بھی وہابی کہنا
شروع کر دیا۔ گویا ہندوستان کے تقریباً تمام مسلمان تفرقہ بازی، انتشار اور آپ کی تکفیر کا نشانہ
بن کر رہ گئے۔

تکفیر بازی :

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ آپ نے ۱۸۹۸ء میں ایک فتویٰ بعنوان "اعلام الاعلام بان
ہندوستان دارالاسلام" شائع کیا جس میں ہندوستان کو محض اس بنا پر دارالاسلام قرار دیا گیا تھا کہ یہاں
مسلمانوں کو نجی طور پر نماز، روزے اور حسب شرع نکاح و طلاق کی اجازت ہے۔ اس فتویٰ سے
انگریز کے سیاسی استحکام کو بہت نقوبت پہنچی۔ مجاہدین نے ہندوستان کو دارالحرب سمجھ کر ہی تحریک
شروع کی تھی۔ لہذا وہ سب کا قریباً یہودیوں سے بھی بدتر قرار دیے گئے۔ تمہید ایمان اوجام الحرمین
میں تو اعلیٰ حضرت حلی صاحب گالی گلوچ پر انرا آٹے چٹا پنچم صفحہ ۴۳ سے ۴۲ تک پورے دس صفحات پر
مشتمل گالیوں کی ایک طویل فہرست مرتب کی ہے جو قابل دید ہے۔ "دورخ کے کتے" آپ کا تحکام
ہے صفحہ ۱۲ پر مناظرانہ رنگ میں آٹو، گدھے اور سورتنگ مخالفین کو کہہ دیا۔ اور یہی جگہ وہابیوں کو
واجب القتل قرار دیا۔ بلکہ یہاں تک لکھا کہ ایک وہابی کو قتل کرنا سو کا فر کے قتل سے افضل ہے اور
بادشاہ اسلام اس کا مجاز ہے۔

صفحہ ۶۸ پر لکھا :

"یہودی کا ذبیحہ حلال ہے اگر خدا کا نام لے کر کرے مگر وہابی دیوبندی کا ذبیحہ نجس اور
مروار قطعی ہے اگرچہ لاکھ بار خدا کا نام لے، یہ سب مرتد ہیں !"

اس فتویٰ کی زد میں صرف تحریک مجاہدین کے وہابی ہی نہ آئے بلکہ انگریز کے خلاف تحریک آزادی
کی جتنی بھی انجمنیں وجود میں آئیں، خواہ وہ مسلم لیگ ہو یا جمعیتہ العلماء ہند یا مجلس احرار، ان سب
انجمنوں کے لیڈروں اور ممبروں پر جناب احمد رضا خاں صاحب اور ان کے خاص معتقدین نے کفر کا
فتویٰ لگایا اور ان سے تعاون حرام قرار دیا۔ حتیٰ کہ بانی پاکستان محمد علی جناح اور علامہ اقبال بھی نہ
بچ سکے۔ بانی پاکستان کے متعلق فرمایا :

”بحکم شریعت مسطر جینا (جناس) اپنے عقائد کفریہ قطعیہ یقینیہ کی بنا پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے۔ جو شخص اسے مسلمان جانے یا اسے کافر نہ مانے یا اس کے مرتد ہونے میں شک رکھے یا اس کو کافر کہنے میں توقف کرے وہ بھی کافر! (تجانب الہنت ص ۱۲۲)
علامہ اقبال پر تو پورے ۴ صفحے سیاہ کئے گئے، لکھتے ہیں:
”ڈاکٹر اقبال نے دہریت والحداد کا زبردست پراپیگنڈہ کیا ہے“ (تجانب ص ۳۳)
علامہ موصوف پر اس قدر برہمی کا باعث غالباً آپ کا یہ شعر بنا، جو آپ کے فتویٰ کے بالکل برعکس تھا۔

ملاں کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

ڈاکٹر اقبال پر سب سے پہلے کفر کا فتویٰ مولوی دیدار علی شاہ والد ماجد سید ابوالبرکات احمد انجمن حزب الاحناف لاہور نے لگایا تھا۔

غلام حسن نظامی دہلوی، شبلی نعمانی اور الطاف حسین حالی بھی حضرت خاں صاحب کے فتویٰ تکفیر سے نہ بچ سکے (تجانب ص ۱۲۱) حالی پر کفر کے فتویٰ کا سبب ان کے غالباً یہ اشعار تھے:
کہے غیر گرت کی پوجا نہ کافر جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر کو اکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کتہہ رہیں راہیں،
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں!

نبی کو ہو چاہیں خدا کہ دکھائیں اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید سے کچھ غلط اس میں آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

ناظرین مذکورہ بالا تفصیل اگرچہ ایک انگ موضوع ہے تاہم اس سے قبل نایہ مقصد و فحاشی کہ جناب خاں صاحب نے اپنے فرقہ کے سراباقی تمام مسلمانوں کو کافر اور گردن زدنی قرار دیا۔ سیاسی فرقوں کو اسلئے کہ وہ انگریز کے خلاف تحریک آزادی میں مشغول تھے۔ اور مذہبی فرقوں کو اس لئے کہ ان کے عقائد آپ کے عقائد سے ٹکراتے تھے۔

محبت کا معیار :

جب کوئی قوم اپنے نبی کی تعلیم اور اس پر عمل سے عاری ہو جاتی ہے تو وہ ”پدرم سلطان بود“ کے مصداق اپنے نبی کی شان کو بڑھ چڑھ کر بیان کرنا شروع کر دیتی ہے۔ یہی کچھ پہلی امتوں نے کیا اور یہی روش عاشقانِ رسول نے اختیار کی۔ اس فرقہ کے پیشوا امام اہل سنت ”صرف عالم ہی نہ تھے شاعر بھی تھے۔ آپ کے تعبیہ کلام کے مجموعہ کا نام ”حدائقِ بخشش“ ہے۔ ان نعتوں میں آپ نے اکثر مقامات پر عہد اور معبود کے فرق کو یکسر ختم ہی کر دیا ہے مثلاً :

میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب

یعنی محبوب و محب میں نہیں میرا تیرا

یعنی حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چونکہ مالک (خدا) کے حبیب ہیں، تو بس انہیں بھی میں مالک ہی سمجھتا ہوں کیونکہ محبوب اور محب کی ملکیت (ملکوت السموات والارض) مشترک ہی ہوتی ہے۔

گویا اب حبِ رسول کا معیار یہ ٹھہرا کہ جو کوئی شرک کی اس پر خارا وادی میں جتنی زیادہ جولاہی دکھائے، اتنا ہی زیادہ وہ محب اور عاشقِ رسول ہے۔ چنانچہ آپ کے محب اس میدان میں آپ سے بھی بازی لے گئے جس کی صدماتِ شائیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

السوس، ان لوگوں نے حبِ رسول کا معیار وہ قائم کیا جس سے آپ نے سختی سے منع فرمایا تھا۔ اس کے برعکس جو معیار محمدؐ آپ نے بنایا ہے ذرا وہ بھی سنئے اور غور فرمائیے کہ دلوں میں کس قدر تضاد ہے :

”عن عبد اللہ بن مسعود، قال جاء رجل الى النبي صلى الله تعالى عليه وسلم فقال :

”يا ابي عبدك“ قال : ”انظر ماذا تقول؟“ قال : ”اني احبك ثلاث مرات“ قال : ”ان

كنت صادقا فأعني للفقر تعاقبا“ ثم لفقر اسرع الى من يحبني“ من السيل الى مثناه“

وفي رواية : ”أت الفقراء من يحبني منك اسرع من السيل من اهل الواعظ“

”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا : یا رسول اللہ! میں آپ سے محبت رکھتا ہوں، آپ نے فرمایا،

”سوچ لو جو کہہ رہے ہو؟ اس نے تین مرتبہ آپ سے محبت کے دعویٰ کو دہرایا۔ آپ نے فرمایا : اچھا ابھی

لے تجھاف لہے کے اس جھول کو کہتے ہیں جو لڑائی کے موقع پر گھوڑے کی حفاظت کیلئے اس کے اوپر ڈالا جاتا ہے۔

فقر اور اس کے ساتھ آنے والی تکلیفوں کیلئے لوہے کا ایک جھول تیار کر لو، کیونکہ مجھ سے محبت رکھنے والے کی طرف فقر اس سے بھی زیادہ تیزی سے آتا ہے جیسے رکا ہوا پانی نشیب کی طرف جاتا ہے؟

اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں کہ تمہیں سے جو مجھ سے محبت رکھتا ہے اس کی طرف فقر اس سے بھی زیادہ تیزی سے آتا ہے جیسے کہ وادی کی بلندی سے پانی نشیب کی طرف جاتا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے محبت رکھنے والے صحابہ کرام پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور جس حد تک کسی نے محبت کا دعویٰ کیا اسی حد تک وہ ضرور متاثر ہوا۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے

«اشتد البلاء علی الدنیاء ثم الامثل فالامثل»

کہ ”سب سے زیادہ مصائب انبیاء پر نازل ہوتے ہیں، پھر ان کے ساتھیوں اور پھر ان کے ساتھیوں پر!“

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان مجاہدان رسول پر کیا مصائب نازل ہوئے جنہوں نے جہاد کو یکسر موقوف کر کے حبش و آرام کو ترجیح دی اور کھانے پینے کی کئی بدعائد رسومات کو شریعت کا درجہ دے دیا۔ تو کیا صرف زبانی محبت کا دم بھرنے، نبی کی شان میں غلو کرنے، جشن عید میلاد النبی منانے اور جلوس نکالنے سے، جن میں سے ہر ایک فعل شریعت مطہرہ کے یکسر خلاف ہے، یہ لوگ نبی کی محبت کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟ اور اس سے زیادہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ انہیں قرآن و سنت کی تعلیم کس طرح اس آسکتی ہے؟

بہنی وجہ ہے کہ امام اہل سنت نے ”کنز الایمان“ کے نام سے قرآن کریم کا ترجمہ کیا تو اس ترجمہ میں بریکٹوں میں ایسے الفاظ کا اضافہ کر دیا کہ عقل دنگ رہ جاتی اور انسان سرپیٹ کے رہ جاتا ہے۔ مثلاً آپ نے ہر مقام پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بشر کے بجائے نور اور عالم الغیب ثنابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر ان دو باتوں کو ہی درست تسلیم کر لیا جائے تو جہاں آپ کی بعثت کا مقصد ہی سرے سے فوت ہو جاتا ہے وہاں آپ کی ذات پر ایسے ایسے اعتراضات اٹھ کر دے ہوتے ہیں کہ اگر تمام امت مسلمہ بھی ان اعتراضات کے جوابات سے عہدہ برا ہونا چاہے تو کبھی نہ ہو سکے۔

بعض دفعہ ہمیں بریلوی علماء کے اس تعصب پر سخت افسوس آتا ہے کہ کسی تو اس آیت ہ انا انابشر مثلكہ ”کہ وہابیوں والی آیت کہہ دیتے ہیں اور محمومان نماز میں ایسی آیات پڑھنے سے گریز کرتے ہیں اور کہیں ”وان كنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا“ کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس آیت کی بس تلاوت ہی لازم ہے، اس کا ترجمہ نہیں ہے اور حقیقی مطلب اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے؟

جہاں یہ صورت حال ہو تو کیا آپ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ یہ لوگ قرآن کریم کے ترجمہ کی طرف توجہ دینگے جبکہ اس طبقہ کو قرآن و سنت کی خالص تعلیم کی ضرورت ہی نہیں ہے؟ — چنانچہ قرآن نافی کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب عاشقانِ رسولؐ کا یہ رویہ ہے!

غیر مسلموں نے مسلمانوں کو کمزور کرنے اور انہیں اسلامی تعلیمات سے دور رکھنے کیلئے جو کچھ کیا، وہ ایک الگ داستان ہے۔ یہاں ہم صرف ان اسباب کا جائزہ لے رہے ہیں جن کی وجہ سے گھر کو گھر ہی کے چراغ سے آگ لگ گئی۔ بہر حال یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ قرآنی تعلیمات کی ترویج کے سلسلے میں ہمیں انبیاء کی طرف سے اتنا نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔

بقول شخصے ج

من از بیگانگان ہرگز نہ تالم
کہ با من ہرچہ کرد آن آشنا کرد

کہ ”میں بیگانوں کا رونا نہیں روتا، میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے، ایوں ہی نے کیا ہے“ اور یہی وہ حقیقت ثابت ہے جس کی گواہی خدا کے حضور قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی دیں گے:

”وقال الرسول یدب ات قومى اتخذوا هذا القرآن مهجورا“

”اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماینگے کہ اسے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔“

صحیح حل:

قرآن کریم محض اس لئے نازل نہیں ہوا تھا کہ اسے متبرک کتاب سمجھ کر ریشمی غلاف میں محفوظ کر کے بلند طاقتوں پر سجا دیا جائے یا جھگڑے کی صورت میں بطور قسم سروں پر اٹھایا جائے۔ یا تبرک کے طور پر کسی تقریب کا افتتاح کر لیا جائے۔ نہ ہی یہ اس لئے نازل ہوا کہ حروف، آیات اور کلمات کی صحیح صحیح گنتی کی جائے یا اسے اعلیٰ کاغذ پر خوشنما کر کے طبع کر دیا جائے۔ بلکہ یہ کتاب ہلادی ہدایت کے لئے نازل ہوئی تھی کہ اسے سمجھا جائے، اس میں تدبر کیا جائے اور اس کی ہدایات اور احکام پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی کو سنوارا جائے اور اسلام کی سربلندی کیلئے کوشش کی جائے۔

لہذا ہمارے خیال میں اس کی بہترین صورت وہی ہے جس کی طرف ہم آغاز میں اشارہ کر چکے ہیں کہ بچے کو ابتدا ہی سے قرآنی الفاظ کے معانی سے بھی روشناس کرایا جائے بچے بالکل ابتدائی

تعلیم مجددوں اور گھروں میں حاصل کرتے ہیں۔ اسی بنیاد سے یہ عمارت کھڑی ہوئی چاہیے۔ اور مدارس عربیہ میں تو لازماً پہلے ہی سال صرف دسھو کے ساتھ ساتھ ترجمہ قرآن بھی سرسری طور پر ختم کیا جانا چاہیے۔ تاکہ اگر کوئی طالب علم مدرسہ کا کورس پورا نہیں کر پاتا تو کم از کم قرآن کریم کے ترجمہ سے توروٹناس ہو۔ چنانچہ اسی نظریہ کے تحت راقم الحروف نے بچوں کو ابتدا ہی سے ترجمہ پڑھانے کا تجربہ گھر سے شروع کیا ہے جس کے نتائج نہایت حوصلہ افزا ثابت ہوئے ہیں اور اسی بنا پر ہم یہ بات نہایت وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اونچی سطح پر بھی یہ تجربہ انشاء اللہ نہایت کامیاب ثابت ہوگا۔

ہمارا پروگرام :

حفظ کرنے والے بچوں کو اگر ترجمہ بھی پڑھا دیا جائے تو انہیں حفظ کرنے میں بھی سہولت رہتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ترجمہ پڑھنے سے بچے بھی خوش ہوتے ہیں اور ان کے والدین بھی۔ بچے جب اپنے گھروں میں جا کر والدین کو اپنے سبق کا ترجمہ بھی سناتے ہیں تو وہ باخ باخ ہو جاتے ہیں۔ مدرسہ میں نظم و ضبط پیدا کرنے کیلئے ہم نے یہ التزام کیا ہے کہ جو بچہ کلاس سے غیر حاضر ہوگا اسے پچاس پیسے یومیہ جرمانہ ہوگا۔ فیس مطلقاً نہیں ہے۔ بچے اولاً تو بہت کم غیر حاضری کرتے ہیں اور اگر غیر حاضری ہو جائے تو جرمانہ کی رقم بخوشی ادا کر دیتے ہیں اور یہ جرمانہ ان کی انتہائی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ اندر میں صورت سب دوستوں سے گزارش ہے کہ وہ اس بے عداہم کام کی طرف فوری توجہ دیں اور ناظرہ قرآن کریم پڑھانے کے ساتھ ساتھ بچوں کو ترجمہ مکھانے کا بھی التزام کریں۔

بازار سے جو ابتدائی قاعدے دستیاب ہوتے ہیں، ان میں بعض الفاظ مہمل بھی ہوتے ہیں اور بعض الفاظ معانی کے لحاظ سے دقیق بھی۔ لہذا ہم ایک ایسا قاعدہ مرتب کرنا چاہتے ہیں جس میں تقریباً تمام الفاظ قرآنی ہوں اور بامعنی بھی ہوں۔ اس قاعدہ میں یہ التزام بھی رکھا گیا ہے کہ کسی جاندار کی تصویر قاعدہ میں شائع نہ کی جائے۔ قاعدہ کی ضخامت ۴۴ چھوٹے صفحات سے زیادہ نہ ہو اور قیمت بھی پچاس پیسے سے بڑھنے نہ پائے۔ اگر یہ قاعدہ حسب خواہش زیور طباعت سے مزین ہو گیا تو ابتدا ہی سے عربی الفاظ کا ترجمہ پڑھانے کی طرف یہ ایک اہم قدم ہوگا۔

آخر میں ہم قارئین سے اس پروگرام کی تکمیل میں کامیابی کی دعا کی درخواست کے ساتھ ساتھ یہ اپیل بھی کریں گے کہ وہ اس اہم ترین فریضہ کی انجام دہی میں ہر ممکن تعاون کریں جس کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہر حلقہ میں، ہر سطح پر اس پروگرام کو فروغ دیں اور قرآنی تعلیمات کی ترویج کے سلسلہ میں اپنے فرائض سے کما حقہ عہدہ برآ ہو کر عند اللہ ناجور ہوں۔ اگر قبول افتداز ہے عز و شرف !